تیسیر قرآن، مفہوم اور مغالطے

ڈاکٹر اختر حسین عزمی ○

قرآن نے خود کو آسان قرار دیا ہے (سورۂ قمر، سورۂ مریم، سورۂ دخان)۔ آسان ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ کیا ہر شخص قرآن کے مفہوم کو متعین کرسکتا ہے؟ اس بارے میں دو انتہائی رویے پائے جاتے ہیں: ایک ان دین دار لوگوں کا جو درسِ قرآن دینے، حتیٰ کہ ترجمۂ قرآن پڑھنے کو بھی ایمان کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں اور اسے سمجھنے سے پہلے ۱۷، ۱۸ علوم کے جاننے کو شرط قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف پروٹسٹنٹ فکر سے متاثر جدید افکار کا علَم بردار طبقہ یہ کہتا ہے کہ دینی ماخذ کی تفسیر و تعبیر پر کسی طبقے کی اجارہ داری نہیں، الہامی کتاب کا ہر ماننے والا اس کی تشریح کا حق رکھتا ہے۔

یاد رہے عیسائی مذہب کی اصلاح کی پروٹسٹنٹ تحریک پاپائیت کے اس جبر کا ردعمل تھی جس نے یورپ کی نشاتِ ثانیہ کے دور میں سائنسی مفکرین و فلاسفہ کی سوچ کو اپنے مذہبی عقائد پر حملہ سمجھتے ہوئے ان کے خلاف نہ صرف گمراہی کے فتوے دیے بلکہ سخت گیر سزائیں بھی دیں۔ مارٹن لوتھر نے جواب میں کہا: خدا نے انجیل انسانوں کی رہنمائی کے لیے نازل کی ہے اور ہر عیسائی کی نجات کا دارومدار اس کے انفرادی عقیدہ و اعمال پر ہے۔ اس لیے ہر آدمی کا یہ حق ہے کہ وہ براہِ راست کلامِ الٰہی کو پڑھے اور دینی اُمور سے متعلق خود فیصلہ کرے۔ اس لیے کہ نجات کے لیے اصل ذمہ دار فرد ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے اختیار بھی چاہیے۔ چنانچہ ہر فرد کو اختیار ہے کہ وہ بائیبل کی تعبیر کرسکے۔ گویا ہر فرد کو تفسیر بالرائے کی آزادی دے دی گئی۔

ہمارے ذرائع ابلاغ میں موجود ایک بڑا طبقہ اس بات کا پرچارک ہے کہ کوئی بھی عالمِ دین

○ صدر شعبہ علومِ اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، ٹاؤن شپ، لاہور

قرآن کی تشریح کا اجارہ دار نہیں کہ اس کی تفسیر وتعبیر کو آخری سند مانا جائے۔ بلاشبہہ الہامی ہدایت کی تفسیر وتعبیر پر کوئی طبقہ اجارہ داری کا حق نہیں رکھتا اور اسلام میں نہ تو وراثتی برہمنیت کا کوئی تصور ہے اور نہ پاپائیت کا نظام۔ اسلام تو آیا ہی اس لیے تھا کہ بندے اور ربّ کے درمیان جو ہستیاں حائل ہوگئی تھیں، ان کی رکاوٹ کو ختم کردے۔ لیکن کیا ہر شخص یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ قرآنی مفاہیم کا تعین کرسکے، اور کیا دنیا کے دیگر شعبہ ہاے زندگی کے اُمور سے متعلق بھی ہر شخص کی راے معتبر گردانی جاتی ہے؟ کیا کسی طبّی عارضے کے بارے میں کسی انجینیر کی راے کو وہی اعتبار حاصل ہوگا جو ایک ڈاکٹر یا طبیب کی راے کا ہوسکتا ہے؟ کیا کسی قانونی مسئلے کی تفہیم میں کسی ڈاکٹر کی راے کسی قانون دان کی راے کے ہم پلہ قرار دی جاسکتی ہے؟ غرضیکہ ہر علم سے متعلق اسی شخص کی راے صائب قرار دی جاتی ہے جس نے اس علم کے اصول ومبادی سیکھنے میں زندگی کا ایک عرصہ کھپایا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول: ''قرآنِ کے اسرار وحکم کے خزانے پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانے سے بقدرِ صلاحیت واستعداد وہ لوگ حصّہ پاتے ہیں جو کتابِ الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور اُن شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں''۔ (تزکیۂ نفس، ص ۳۱)

تیسیر قرآن: مفسرین کی آرا

کسی آیت کا شانِ نزول کیا ہے؟ ناسخ ومنسوخ آیات کون سی ہیں؟ کسی آیت کا سیاق وسباق کیا ہے؟ غریب الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ کوئی لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے یا مجازی معنی میں؟ حذف ومحذوف اور محکم ومتشابہ آیات کا علم، اصولِ تفسیر اور ماخذ تفسیر کو گہرائی سے جانے بغیر قرآنی مفاہیم کے تعین میں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ موجود ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہر شخص اس قابل نہیں کہ وہ قرآن سے صحیح طور پر استفادہ کرسکے، جب کہ قرآن خود کو تذکیر کے لیے آسان قرار دیتا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ (القمر ۵۴:۱۷) ''ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟''

● مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''لِلذِّكْرِ، ذکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے بھی۔ یہ دونوں معانی یہاں مراد ہوسکتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو حفظ کرنے کے لیے آسان کر دیا۔ یہ بات اس

سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی..... اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اپنے مضامینِ عبرت ونصیحت کو ایسا آسان کرکے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم و ماہر، فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اسی طرح ہر عامی وجاہل جس کو علم سے کوئی مناسبت نہ ہو، وہ بھی عبرت ونصیحت کے مضامینِ قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔آیت میں یَسَّرۡنَا کے ساتھ لِلذِّکۡرِ کی قید لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی حد تک آسان کردیا گیا ہے جس سے ہر عالم وجاہل، چھوٹا بڑا یکساں فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآنِ کریم سے مسائل واحکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماے راسخین کو ہی حصّہ ملتا ہے، ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو قرآن کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم اس کے اصول وقواعد سے حاصل کیے بغیر مجتہد بننا اور اپنی راے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے‘‘ (معارف القرآن، جلد ۸، ص ۲۳۰)۔

● مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بقول: ’’بعض لوگوں نے یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ کے الفاظ سے یہ غلط مطلب نکال لیا ہے کہ قرآن ایک آسان کتاب ہے، اسے سمجھنے کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ عربی زبان تک سے واقفیت کے بغیر جو شخص چاہے اس کی تفسیر کرسکتا ہے اور حدیث وفقہ سے بے نیاز ہوکر اُس کی آیات سے جو احکام چاہے مستنبط کرسکتا ہے۔ حالانکہ جس سیاق وسباق میں یہ الفاظ آئے ہیں، اُس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد کا مدّعا لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ نصیحت کا ایک ذریعہ تو ہیں وہ عبرت ناک عذاب جو سرکش قوموں پر نازل ہوئے، اور دوسرا ذریعہ ہے یہ قرآن جو دلائل اور وعظ وتلقین سے تم کو سیدھا راستہ بتا رہا ہے۔ اُس ذریعے کے مقابلے میں نصیحت کا یہ ذریعہ زیادہ آسان ہے۔ پھر کیوں تم اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور عذاب ہی دیکھنے پر اصرار کیے جاتے ہو؟ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اپنے نبیؐ کے ذریعے سے یہ کتاب بھیج کر وہ تمھیں خبردار کررہا ہے کہ جن راہوں پر تم لوگ جارہے ہو وہ کس تباہی کی طرف جاتی ہیں اور تمھاری خیر کس راہ میں ہے؟ نصیحت کا یہ طریقہ اسی لیے تو اختیار کیا

گیا ہے کہ تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے تمھیں اُس سے بچا لیا جائے۔ اب اُس سے زیادہ نادان اور کون ہوگا جو سیدھی طرح سمجھانے سے نہ مانے اور گڑھے میں گر کر ہی یہ تسلیم کرے کہ واقعی یہ گڑھا تھا'' (تفہیم القرآن، جلد ۵، ص ۲۳۴-۲۳۵)۔

● مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں: ''اس آیت کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو حفظ کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب بنایا ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود صحیح ہے لیکن آیت کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔ لفظ تیسیر عربی میں کسی چیز کو کیل کانٹے سے درست کرنے، پیش نظر مقصد کے لیے اس کو اچھی طرح موزوں بنانے اور جملہ لوازم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے معنوں میں آتا ہے، مثلاً یَسَّرَ الْفَرَسَ لِلرَّکُوب کے معنی ہوں گے گھوڑے کو تربیت دے کر، اس کو کھلا پلا کر، زین، لگام، رکاب سے آراستہ کر کے سواری کے لیے بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا..... لفظ ذکر بھی یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، یعنی تعلیم، تذکیر، آگاہی، تنبیہہ، نصیحت، موعظت، حصولِ عبرت اور اتمامِ حجت، سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں..... ہماری فطرت اور ہماری عقل کے اندر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے جو خزانے ودیعت فرمائے ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں، (قرآن) انھی کو ہمارے سامنے اُجاگر کرتا ہے..... تم مچلے ہوئے ہو کہ جب اس عذاب کی نشانی دیکھ لو گے تو مانو گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن اُتارا ہے جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے جملہ لوازم سے آراستہ و مسلّح ہے تو آخر اس عظیم نصیحت سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھاتے، عذاب کے تازیانے ہی کے لیے کیوں بے قرار ہو!'' (تدبر قرآن، جلد ۸، ص ۹۹-۱۰۰)

فہم قرآن کے دو درجے

اب تک کی بحث سے ہمیں فہم قرآن کے دو درجے معلوم ہوئے۔ قرآن کے الفاظ میں ایک درجے کو ہم تذکر اور دوسرے کو تدبر کہہ سکتے ہیں:

● **تذکر:** اس سے مراد نصیحت کرنا، متنبہ کرنا، یاد کرنا ہے۔ گویا علم کے مطابق عمل کرنے کا عزم کرنا۔ قرآن کے ایک ایک لفظ کا تو نہیں البتہ مجموعی پیغام کا ادراک کرنا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کے سب سے پہلے مخاطبین اُونٹ اور بکریاں چرانے والے بدو، تاجر اور کاشتکار تھے۔

ان میں سے ایک فی صد بھی پڑھے لکھے نہ تھے۔ ان کے پاس صَرف ونحو، فلسفے اور تاریخ کی کوئی کتاب نہ تھی۔ لیکن انھوں نے قرآن سے جو اثر لیا اور وہ ان کے عمل میں ڈھل گیا۔ یہ وہ علم تھا جس کی تعلیم دینا قرآن کا مقصد تھا اور جس کی بنیاد پر وہ دنیا کو بہترین تہذیب وتمدن دینے والے بن گئے۔

● **تدبر**: اس سے مراد ایسا غور وخوض کہ قرآن کے ایک ایک لفظ، آیت اور سورۃ کے مفہوم و مقاصد کو سمجھا جاسکے۔ اصولِ تفسیر اور علومِ تفسیر سے آگہی کے ساتھ یہ تدبر ہی ہے جو ایک انسان کو استنباطِ احکام، تفقہ فی الدین اور فتویٰ وتفسیر لکھنے کا اہل بناتا ہے۔ یہی وہ عمل تھا جس کے لیے صحابۂ کرامؓ ایک ایک سورۃ کے سمجھنے میں کئی کئی ماہ وسال صرف کرتے تھے۔ یہ تدبر ہی ہے جس کے ذریعے سے ازروے حدیث قیامت تک قرآن کے نت نئے عجائب کھلتے چلے جائیں گے۔

قرآن کا عام فہم ہونا

کسی بھی کلام کی آسانی دو پہلوؤں سے ہوتی ہے: ۱- اس کے الفاظ وعبارات نامانوس اور پیچیدہ نہ ہوں۔ ۲- اس کے مضامین اور نظریات قابلِ فہم اور آسان ہوں۔

قرآن اپنے موقف کو منوانے کے لیے آفاق و انفس کے ایسے فطری دلائل دیتا ہے جو ہر دور اور ہر سطح کا انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس میں فلسفہ وکلام کا اسلوبِ استدلال نہیں ہے کہ ایک خاص سطح کے لوگ ہی سمجھ سکیں۔

امام غزالی (م: ۵۰۵ھ) قرآنی دلائل اور متکلمین وفلاسفہ کے دلائل کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے ہر انسان فائدہ اُٹھاتا ہے، اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جن سے کچھ افراد تو فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی ہے جس سے دودھ پیتا بچہ اور تنومند آدمی دونوں فائدہ اُٹھاتے ہیں، جب کہ دوسرے دلائل کھانوں کی طرح ہیں جن سے صحت مند لوگوں کو کبھی فائدہ پہنچتا ہے تو کبھی نقصان، لیکن دودھ پیتے بچے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے'' (علم الکلام، ص ۲۰)۔

امام فخرالدین رازی (م: ۶۰۶ھ) متکلمین وفلاسفہ کے امام ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''میں نے علمِ کلام اور فلسفے کے طریقوں کو آزمالیا ہے۔ یہ نہ تو کسی پیاسے کی پیاس بجھا سکتے ہیں اور نہ کسی بیمار کو شفا دے سکتے ہیں۔ میں نے سمجھ اور دیکھ لیا ہے کہ تمام راستوں کے مقابلے میں قریب ترین

اور آسان ترین راستہ قرآن کا راستہ ہے'' (البدایہ والنہایہ، جلد ۱۳، ص ۵۶)۔

امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں: ''قرآن کریم کا طرزِ استدلال لوگوں کے ذہنوں کے زیادہ قریب ہے اور ان کی عقل میں بات کو بٹھانے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ قرآنی دلائل کو اذہان و افہام کے قریب ترین ہی ہونا چاہیے تاکہ ان سے خواص و عوام دونوں نفع اُٹھا سکیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنی دلائل کا مقصد مجادلہ و مناظرہ نہیں بلکہ صحیح اور سچے عقائد کو دلنشین کرانا ہے، اور اس مقصد کے لیے قرآنی دلائل دوسرے تمام طریقوں سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں''۔

قرآن کے آسان ہونے کے ایک پہلو سے متعلق مولانا اصلاحی کہتے ہیں: ''قرآن مجید بنی نوعِ آدم کے تمام طبقات کے لیے صحیفۂ ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جو اس پر ایمان لائے گا، فلاح پائے گا اور جو اعراض کرے گا، وہ ہلاک ہوگا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم و دعوت کا معیار عام عقل انسانی کے معیار کے مطابق ہوتا کہ ہر انسان جو فکر و نظر کی عام استعداد رکھتا ہے اس کو سمجھ سکے، اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خالق کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ ایک ایسی کتاب جس کا مقصد عام تعلیم و دعوت ہو، نہ تو لفظاً اتنی پیچیدہ ہونی چاہیے کہ جب تک خواص اس کی مشکلات حل نہ کریں، وہ سمجھ نہ آئے، اور نہ معناً اتنی مبہم اور دقیق ہونی چاہیے کہ انسانی فہم و ادراک کی عام استعداد اس کے اسرار و رُموز سمجھنے سے قاصر ہو'' (مبادی تدبر قرآن، ص ۱۰۴-۱۰۵)۔

قرآن نے توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات پر عقلی دلائل بھی دیے ہیں اور نقلی بھی۔ نقلی دلائل میں جن انبیاے کرام اور صلحا، جیسے حضرت لقمان، حضرت مریم، اصحابِ کہف اور طاغوت، جیسے فرعون، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل وغیرہ کے واقعات بیان کیے ہیں۔ عرب ان سے مانوس تھے، جب کہ عقلی دلائل ایسے ہیں جو ایک اَن پڑھ آدمی کو بھی اپیل کرتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ان کی قوتِ تاثیر کا انکار نہیں کرسکتا۔ مثلاً زمانۂ قید کے دوران حضرت یوسفؑ سے ان کے قیدی ہم نشین اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر جاننے کے خواہش مند ہوئے تو آپ نے بھی ان کے سامنے ایک سوال رکھا: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ (یوسف ۱۲: ۳۹) ''کیا (کسی غلام کے لیے اس کے) کئی آقا بہتر ہیں یا ایک ہی اللہ غلبے والا؟''

سوال کی صورت میں یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کے مخاطب کے لیے 'ایک' کہے بغیر چارہ

نہیں۔ اور اتنا کہنے کے لیے قائل کو اصولِ تفسیر اور علومِ قرآنی کی تحصیل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب اللہ یہ فرماتا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیاء ۲۱:۲۲) ''اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہوجاتے''۔ یہ ایسی دلیل ہے جو چودہ سو سال پہلے کے عالم و جاہل کو بھی اپیل کرتی تھی اور آج کے ترقی یافتہ زمانے کے لوگوں کو بھی۔

دلائل و مضامین کے عام فہم اور آسان ہونے ہی کی وجہ سے قریش قرآن کی تاثیر سے خوف زدہ تھے۔ قرآن نے ان کے اس اندرونی خوف کو یوں افشا کیا ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝۲۶ (حم السجدہ ۴۱:۲۶) ''اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور (جب سنایا جائے تو) شور مچادو تاکہ تم غالب رہو''۔ گویا سردارانِ مکہ کو خدشہ ہے کہ ع ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

اگر کافر قرآن کے ابلاغ کو اپنے طاغوتی غلبے کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اہلِ اسلام کا غلبہ کس چیز سے وابستہ ہے؟ لیکن مسلمان لیڈرشپ، اپنی بقا اور ترقی کے لیے غیرقرآنی تعلیم اور ٹکنالوجی کے حصول کو ہی مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہیں۔ بقول احسان دانش ؎

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دیے سایے ہم نے

کفارِ مکّہ جب اہلِ ایمان کو تضحیک و استہزا، ظلم و تشدد کے باوجود نہ جھکا سکے تو ایک وقت آیا کہ سردارِ مکہ عتبہ بن ربیعہ دولت، سرداری اور بادشاہت کا پیغام لے کر سمجھوتہ کرنے آیا تو اللہ کے رسولؐ نے اسے سورہ حم السجدہ کی آیات کی تلاوت کی صورت میں اپنا پیغام دیا۔ وہ واپس آکر اپنی قوم کو کہنے لگا کہ ''میں نے محمد کی زبان سے جو کلام سنا ہے وہ ضرور کوئی اثر دکھا کر رہے گا'' (ابن ہشام)۔ یہ قرآن کی تیسیر و تاثیر ہی کا کمال تھا کہ مشرکین مکہ کی خواتین اور بچے چھتوں اور دیواروں پر چڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی تلاوت سنتے تھے اور ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔

حضورؐ اور صحابۂ کرامؓ سے جب بھی کوئی اسلام کا تعارف چاہتا تو وہ جواب میں اکثر قرآن کا کچھ حصّہ سناتے۔ شاہِ حبشہ کے دربار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پوچھی گئی تو قرآن سنایا گیا۔

مکہ میں ابوذر غفاریؓ، طفیل دوسیؓ اور دیگر کو رسولؐ اللہ نے قرآن سنایا۔ مدینہ میں مصعب بن عمیرؓ نے اسید بن حضیرؓ، سعد بن معاذؓ اور دیگر کو قرآن سنا کر ہی قبولِ اسلام پر آمادہ کیا۔

قرآن لوگوں کے لیے ہدایت ہے

قرآن خود کو ھُدًی لِّلنَّاسِ (البقرہ ۲:۱۸۵) قرار دیتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کا مخاطب انسان اور اس کا موضوع ہدایت ہے۔ اور انسانوں میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والے اچھے بُرے، عالم و جاہل، سب شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے کسی قسم کے علومِ قرآنی نہیں پڑھے ہوں گے۔ اس کے باوجود قرآن خود کو ان کے لیے ہدایت کہتا ہے: ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ (البقرہ ۲:۲) اور ھُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (یونس ۱۰:۵۷) کہتا ہے اور لازم نہیں کہ تمام متقین اور مومنین علمی رسوخ کے حامل ہوں۔ اب اگر قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے اور ہدایت ہر انسان کی ضرورت ہے تو ضروری ہوا کہ ہدایت کے حصول کا راستہ آسان بھی ہو اور سب کی دسترس میں بھی۔ اس لیے کہ کائنات میں جس چیز کی ضرورت عام ہے قدرت نے اس کی دستیابی کو بھی عام رکھا ہے، جیسے ہوا اور پانی ہر آدمی کی ضرورت ہے تو اللہ نے اسے دوسری چیزوں کی نسبت اتنا ہی عام کر دیا۔ ہدایت وہ چیز ہے جو ہوا اور پانی کی طرح ہر انسان کی ضرورت ہے تو یہ کس طرح درست ہے کہ اس تک انسانی دسترس کو مشکل بنا دیا جائے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا:

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ (مریم ۱۹:۹۷)
پس اے نبیؐ، ہم نے اس قرآن کو آپؐ کی زبان میں اسی لیے آسان کر دیا کہ آپؐ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دیں، اکھڑ اور ہٹ دھرم قوم کو ڈرائیں۔

معلوم ہوا کہ خوشخبری اور ڈراوے کے لیے قرآن آسان بھی ہے اور مؤثر بھی، حتیٰ کہ اسی قرآن کے ذریعے عرب جیسی اکھڑ قوم موم کی طرح نرم ہوگئی۔ اسی طرح تذکیر و یاددہانی کے لیے بھی قرآن آسان ہے۔ فرمایا:

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ (الدخان ۴۴:۵۸) ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

سورۂ قمر کے آغاز میں حضرت نوحؑ کی قوم کی سرکشی اور پھر ان پر نزولِ عذاب کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٦﴾ (القمر ۵۴:۱۶) ''پس کیسا تھا میرا عذاب اور کیسے تھے میرے ڈراوے''۔ اس سے اگلی آیت میں فرمایا: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ (القمر ۵۴:۱۷) ''حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، پس ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے؟'' اس کے بعد قومِ عاد کی تباہی کا ذکر اور آیت ۲۱ میں فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ کی تکرار کے بعد آیت ۲۲ میں يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ کی تکرار ہے۔ بعدازاں قومِ لوط کی سرکشی اور عذاب کے ذکر کے بعد آیت ۳۹ میں عذاب اور اِنذار کے بعد آیت ۳۲ میں تیسیرِ قرآن کی تکرار ہے۔ پھر قومِ لوط کی سرکشی اور عذاب کے ذکر کے بعد آیت ۳۹ میں عذاب اور ڈراوے اور آیت ۴۰ میں چوتھی مرتبہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ کی تکرار اس بات کا اظہار ہے کہ اللہ کی پکڑ سے خبردار کرنے، ڈرانے اور تذکیر و نصیحت کا جتنا آسان ذریعہ قرآن ہے کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔

قرآن کتابِ الٰہی سے اہلِ ایمان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے، دلوں کے نرم پڑنے اور یادِ الٰہی کی طرف متوجہ ہونے کی خبر دیتا ہے:

> تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ (الزمر ۳۹:۲۳) اُسے سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے ربّ سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر اُن کے جسم اور ان کے دل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔

قرآن فہمی کا تقاضا

برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ زوال کی عظیم ہستی شاہ ولی اللہ نے اُمت کے زوال اور فساد کے علاج کے لیے فہم قرآن کو مؤثر علاج سمجھتے ہوئے پہلی مرتبہ قرآن کا فارسی ترجمہ کیا جس کے باعث ان کے خلاف گمراہی کے فتوے بھی صادر ہوئے۔ ان کی کتاب تحفۃ الموحدین کا ذیل کا پیرا اُس ذہن کو سمجھنے میں مددگار ہے جو آج بھی قرآن فہمی میں رکاوٹ ہے۔ شاہ ولی اللہ قرآن فہمی سے خوف زدہ اس ذہن کی ایک ایک خلش کا آیاتِ قرآنی سے یوں ازالہ کرتے ہیں:

''بعض کہتے ہیں کہ قرآن مجید اور احادیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بہت سے علوم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہوا ہو اور اپنے زمانے کا علامہ ہو، جب کہ اللہ فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ (الجمعہ ۶۲:۲)

اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے انھی اَن پڑھ لوگوں میں سے رسول مبعوث کیا جو ان پر اس کی آیات کو تلاوت کرتا ہے، ان کے دلوں کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

یعنی اللہ کے رسولؐ بھی اَن پڑھ اور آپؐ کے اصحابِ بزرگوار بھی اَن پڑھ تھے لیکن جب رسولؐ اللہ نے اپنے اصحابؓ کے سامنے قرآن کی آیات پڑھیں تو ان کو ان کروہ ہر قسم کی بُرائی اور بگاڑ سے پاک صاف ہوگئے۔ پس اگر اَن پڑھ آدمی قرآن و حدیث نہیں سمجھ سکتا اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا تو صحابہؓ بُرائیوں اور عیبوں سے کیسے پاک صاف ہوگئے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم بعد کے زمانے کے لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی برکت اور صحابہؓ کے دل کی سلامتی کہاں سے لائیں جو قرآن و حدیث کے معنی سمجھ سکیں؟ اس کا جواب اس سے اگلی آیت میں ہے: وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ (الجمعہ ۶۲:۳)، یعنی بعد والے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں یا اَن پڑھ، جو بھی مسلمان ہوں اور اصحاب کے طریقے کی پیروی کا ارادہ کریں اور قرآن و حدیث کو سنیں تو انھیں بھی پاک کرنے کے لیے یہ ذریعہ کافی ہوسکتا ہے اور وہ فرماتا ہے: وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کافیہ پڑھنے والے اور شافیہ جاننے والے تو اس قرآن کے معنی سمجھنے سے عاجز ہوں، جب کہ عرب کے جنگلی بدو اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک جگہ یوں فرماتا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (محمد ۴۷:۲۴) ''وہ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟'' پس قرآن آسان نہ ہو تو اس میں غور و فکر کیوں کیا جائے؟ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ''یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟''۔ یعنی باوجود یکہ ان کے دلوں پر تالے نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے کہ قرآن پر غور و فکر میں زور نہیں لگاتے''۔